تیز ہوا میں جنگل مجھے بلاتا ہے

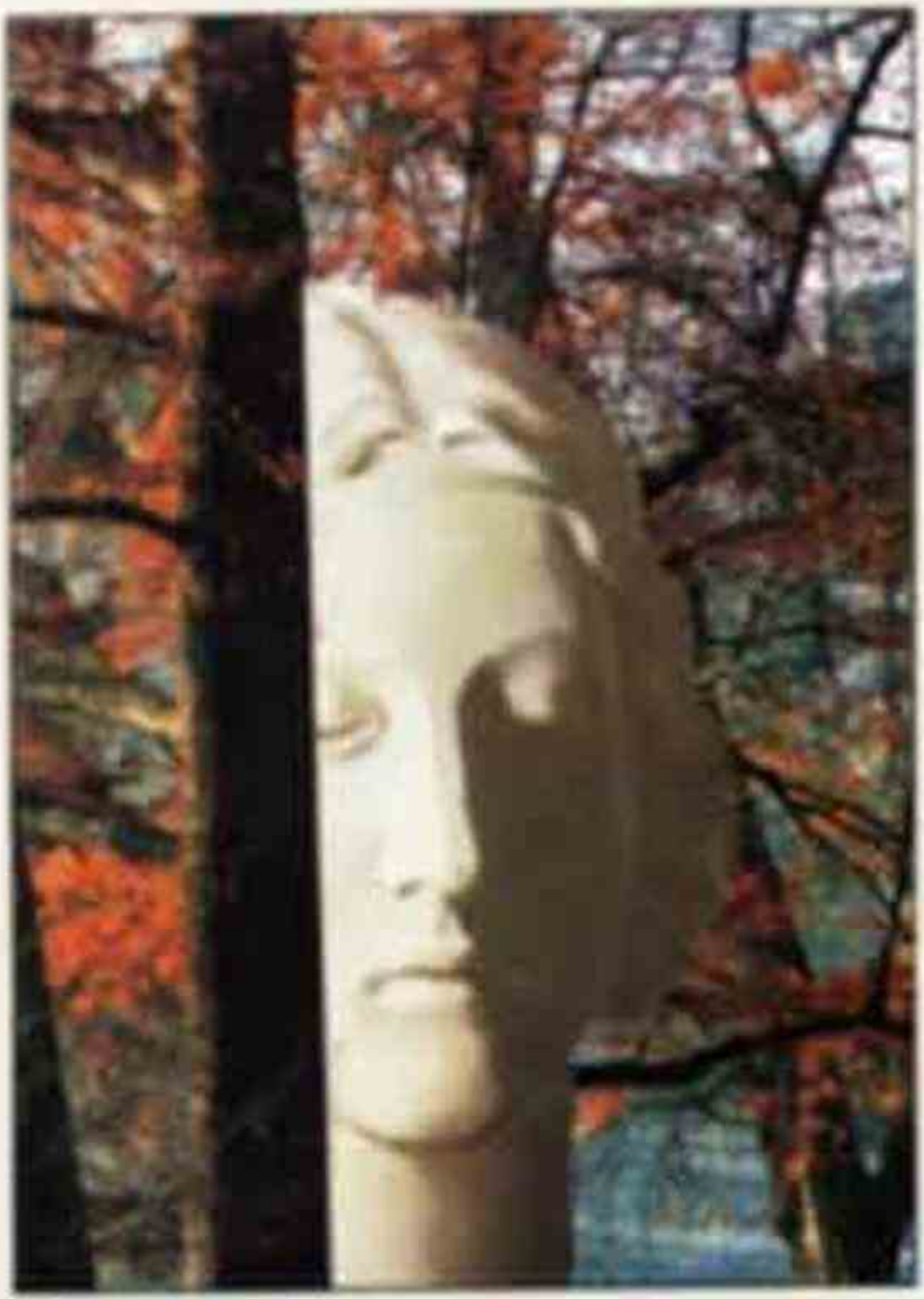

علی محمد فرشی

بسم الله

تیز ہوا میں جنگل مجھے بلاتا ہے

علی محمد فرشی

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
لیو بکس اسلام آباد
PDF Book Company

ساقی ارباب ذوق

LEO BOOKS

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت 1995ء

مطبع پرنٹ سٹائل، 10-اے، پوٹھوہار پلازا، بلیوایریا،
اسلام آباد۔ فون: 220432

ناشر لیوبکس، 5-اے، پوٹھوہار پلازا، بلیوایریا،
اسلام آباد، فون: 814926

قیمت -/172روپے

AUTHOR'S ADDRESS
P.O. Box 773, G.P.O. Rawalpindi
PAKISTAN

0305 6406067
PDF Book Company

شہناز اور ہُنزہ کے نام

ترتیب

دیباچہ	۱۳
میں کب لکھوں گا گیت اپنی رہائی کا	۱۵
دریا جلدی میں ہوتے ہیں	۱۷
اگر تو انگلیاں اپنی مری آنکھوں پہ رکھ دیتی	۱۹
کسی دن تجھ کو روتا چھوڑ جاؤں گا	۲۲
وہ کہتی تھی	۲۳
ڈبل بیڈ پر اکیلی نظم	۲۶
ہوا مر گئی ہے	۲۷
تم نے دیکھا نہیں	۳۳
عورت گیان	۳۵

ساتھی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

جنگل کے راستے میں پڑی ہوئی نظم	۳۷
کبوتروں کے لئے ایک دعائیہ	۳۹
نظمیں پیلی ہو جاتی ہیں	۴۱
''باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی''	۴۳
وہ اکثر بھول جاتی ہے	۴۵
ہوا جب اذن دیتی ہے	۴۶
بارش میں جل پریوں کا ملبوس اتر جاتا ہے	۴۷
موت خوبصورت ہو جاتی ہے	۴۸
جیون دودھاری تلوار ہے سائیں	۴۹
کبوتر صراحی کے چاروں طرف گھومتا ہے	۵۱
بچپن کی ایک بوڑھی یاد	۵۳
بدن کے پار دلدل ہے	۵۴
ایک نظم دریائے سواں کے کنارے پر ڈوب گئی	۵۵
بے وجود آدمی کا دکھ	۵۷
کہانی لکھ رہی تھی	۵۸

0305 6406007
PDF Book Company

پہلے دن کی دھوپ	۵۹
آنکھ میں رکا ہوا انتظار	۶۱
گمشدہ بوڑھا	۶۲
برف نے ساری قبریں اک جیسی کر دی ہیں	۶۳
گمانیہ	۶۸
موت خودکشی کا انتظار کرتی ہے	۶۹
دسمبر بوڑھا ہو جاتا ہے	۷۰
اسے تنہائی سمندر پر لکھتی ہے	۷۱
بلی لوٹن	۷۳
سرگوشی	۷۴
بے خبر کوؤں کی موت	۷۵
زمین کے لئے نظم	۷۶
ہوا مجھ کو بلاتی ہے	۷۷
ٹھہرا ہوا موسم	۷۸
جادوگرنی بھوک بن جاتی ہے	۷۹
وہمی آدمی چوہے دان میں مر جائے گا	۸۰

گوری آپ مقدر والی	۸۱
ناگنی	۸۳
پرانی کہانی	۸۴
وہ زینے میں بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو جاتی ہے	۸۵
کہتے ہیں	۸۶
فراک	۸۷
بہتی عمر کی ناؤ میں	۹۲
سانپ نے اندھے لفظ کا لنچ کیا	۹۳
اس کو کون چنے گا	۹۵
بھوک رونے لگتی ہے	۹۷
PARADOX	۹۹
شاعر	۱۰۰
ایک دن ہوا گر پڑی	۱۰۱
مگر مچھلی خواب کے اندر مر جاتی ہے	۱۰۳
میں واپس آ جاؤں گا	۱۰۵
وقت کی اندھی سرنگ میں	۱۰۷

وہ اپنی آنکھیں میز پر رکھ کر بھاگ گیا تھا	۱۰۹
چیخ اس کی قاتل ہے	۱۱۰
نظم مکمل ہو جاتی ہے	۱۱۱
کبوتر کی خودکشی	۱۱۳
تیز ہوا میں جنگل مجھے بلاتا ہے	۱۱۵
خالی گھروں میں دیور ہتے ہیں	۱۱۷
جنازے کا وقت ہو رہا ہے	۱۱۹
ہوا کے راستے نہیں ہوتے	۱۲۰
دسمبر اس کو لینے آ جاتا ہے	۱۲۱
کبوتر کے پروں پر لکھی لوری	۱۲۳
مجھے اس نے آٹے میں گوندھا ہوا ہے	۱۲۵

دیباچہ

کتابیں یاد رکھتی ہیں
ہوا جب تازہ آتی ہے
کسی سوئے ہوئے موسم کی آنکھوں میں
نئے منظر جگاتی ہے

کتابیں یاد رکھتی ہیں
بدن کی دوسری جانب کھڑی تنہا اداسی کو
جو گیت اپنی رہائی کا نہیں لکھتی
مجھے ساحل پہ لکھتی ہے
کبھی لکھ کر مٹاتی ہے
کبھی لکھنے سے پہلے ہی مٹا کر ---- ہنسنے لگتی ہے

کتابیں یاد رکھتی ہیں
کبوتر کے پروں کے نرم لوری کو
جسے سُن کر وہ روتی ہے

کسی بنجر زمیں کی خشک چھاتی کو بھگوتی ہے
کتابیں یاد رکھتی ہیں
جسے پاگل ہوا کا پیار ملتا ہے
جسے جنگل بلاتا ہے

کتابیں یاد رکھتی ہیں
کسی ویران ساحل سے
جسے اک نظم چُنتی ہے
چھپا لیتی ہے خوابوں میں
کتابوں میں

کتابیں یاد رکھتی ہیں
نئی نظموں کی تاریخِ ولادت کو
کتابیں بُھول جاتی ہیں
کسی کتبے کی تعریفی عبارت کو
کسی بوڑھے مورخ کی شرارت کو!

میں کب لکھوں گا گیت اپنی رہائی کا

وہ کہتی ہے
مجھے تم سے محبت ہے
وہ سچ کہتی ہے---- سچ کہتی رہے گی
ازل کے اولیں دن سے وہ سچ کہتی رہی ہے
ابد کی آخری شب تک وہ سچ کہتی رہے گی!

مجھے دیوار پر اس نے وہاں ٹانکا ہوا ہے
جہاں سے دیکھ سکتا ہوں
زمیں کے اس طرف پھیلی گھنیری، سرمئی تنہائیاں
جو خود اس نے کبھی تحریر کی ہوں گی
ازل سے تا ابد پھیلے خلا پر----!

مگر جب سے

وہ خود اپنی خبر میں ہے

اُسے دیوار کی اس دوسری جانب کی کوئی بھی خبر اچھی نہیں لگتی

خبر نے اس کو کیسا بے خبر رکھا ہوا ہے

اِدھر دیوار کو

(دیوار کے پیچھے کھڑی تنہائیوں کی)

باخبر لمبی زبانیں

چاٹ کر کاغذ بنانے کے عمل میں ہیں!

میں اس کاغذ پہ کب لکھوں گا،

گیت اپنی رہائی کا-------؟

دریا جلدی میں ہوتے ہیں

نیند میں باتیں کرنے والی لڑکی
کہتی تھی

دریا جلدی میں ہوتے ہیں

خشک زمینوں کے رستے میں کب رکتے ہیں

مرنے والے بوڑھے لمحے کیسے واپس آ سکتے ہیں

برفانی طوفانوں میں گھِر جانے والی چڑیاں

لمبی گرم اڑانوں کی خواہش

سرد ہوا کے ہاتھوں پر لکھنے سے پہلے مر جاتی ہیں

وقت کا سایا جن کے سر پر آ جاتا ہے

کچی آنکھیں، سچے خواب، اُدھوری نیند چبا جاتا ہے

پِیلا موسم چپکے سے، ساری ہریالی کھا جاتا ہے

طوفانی بارش

دور کناروں تک گرتی ہے

قبروں میں سوئی یادیں گیلی ہو جاتی ہیں

چہرے کتبے بن جاتے ہیں

مرنے والے بوڑھے لمحے

سانپوں کے لچکیلے جسم بدل لیتے ہیں

جلدی میں جانے والے دریا

واپس آ کر سارا شہر نگل لیتے ہیں!

نیند میں باتیں کرنے والی لڑکی کہتی تھی-----

اگر تُو انگلیاں اپنی مری آنکھوں پہ رکھ دیتی

اگر تُو انگلیاں اپنی مری آنکھوں پہ رکھ دیتی
زمانہ دکھ بھری باتوں کی میلی پوٹلی لے کر
اندھیرے کے سمندر میں اُتر جاتا
مجھے اس شام ساحل پر
تری خوشبو
مکمل جسم کے ملبوس میں مِلتی
کئی صدیوں کی جگراتی ہوا بانہوں میں سو جاتی
ذرا سی لہر پانی کی، کناروں کو بھگو جاتی

اگر تو انگلیاں اپنی مری آنکھوں پہ رکھ دیتی
تو لکھتا میں شہادت اپنے ہونے کی
کسی برگد کی شاخوں پر
سلگتی، زرد، بارانی زمیں کی خشک چھاتی پر
پرانے گمشدہ رستوں،
فراموشی کی نیند اوڑھے سفر پر
کسی بھولی ہوئی تاریخ کے ملبے تلے
سوتے ہوئے گھر پر

اگر تو انگلیاں اپنی مری آنکھوں پہ رکھ دیتی
ہمارے دور تک پھیلے ہوئے صحراؤں پر اک دن
گھنے بادل اُتر آتے
خدا کی مہرباں بارش اچانک تیز ہو جاتی
کنارے دوپہر کے دونوں دُھل جاتے
ہمارے دکھ زمیں پر آسماں کی طرح کھل جاتے

اگر تو انگلیاں اپنی مری آنکھوں پہ رکھ دیتی

میں دیوارِ بدن کی دوسری جانب

تجھے ہر شام کو ملتا تری باتوں کی خوشبو چائے میں گھل کر

اداسی تیز کر دیتی

ہماری گفتگو کے درمیاں

اک نظم چپکے سے دبے پاؤں چلی آتی-----

اگر تو انگلیاں اپنی مری آنکھوں پہ رکھ دیتی!!!

کسی دن تجھ کو روتا چھوڑ جاؤں گا

گھنے خوابوں کے جنگل میں
کسی دن بھول جاؤں گا
میں رستہ لوٹ آنے کا
کسی دن خود کو سوتا چھوڑ جاؤں گا !
کسی دن تجھ کو روتا چھوڑ جاؤں گا !!

وہ کہتی تھی (۱)

وہ کہتی تھی
جو اِک پھول کے اندر رہتی تھی
سات دنوں سے آگے کوئی رات نہیں
ساتویں دن کی شام سے ملنا
سات دنوں تک ہنس ہنس کھلنا
پاگل تتلی! اس سے اچھی کوئی بات نہیں!

وہ کہتی تھی (۲)

وہ کہتی تھی

جو دریا کے ساتھ سمندر تک بہتی تھی

سب سے اچھا ساتھ ہے دل دریا کے دھاروں کا

پیاسے، دُور، کناروں کا

سب سے اچھی پیاس ہے بہتے دریاؤں کی

سب سے اچھی پیاس ہے برگد کی چھاؤں کی

گیان کی جھیل میں ڈُوبی، بوڑھی، زرد جٹاؤں کی!

وہ کہتی تھی (۳)

وہ کہتی تھی
جو تخلیق کا دُکھ سہتی تھی
مٹی پاک مقدر والی
مٹی ---- جس سے بیج اُگے

بیج اُگے پودا بن جائے
کٹنے کا جب موسم آئے
درد کی شاخوں پر بیٹھے
گیت پرندے گائیں
آنکھیں --- راہیں بن جاتی ہیں
خالی آنگن رہ جاتی ہیں مائیں !

ڈبل بیڈ پر اکیلی نظم

خواب لکھتے ہوئے
بھول جاتا ہوں میں
بیڈ پہ لیٹی ہوئی
منتظر بات کو !
جاگتی رات کو !!

ہوا مر گئی ہے

ابھی شام چوکھٹ سے لگ کر کھڑی
کپکپاتے ہوئے سرد ہاتھوں سے
جاتے ہوئے سال کو الوداع کہہ رہی تھی
کہ ٹی وی نے اپنے خصوصی بلیٹن میں
اس سانحے کی خبر دی
خبر پڑھنے والی کی آنکھوں پہ افسوس کی تیز بارش تھی
ہونٹوں سے الفاظ یوں ٹوٹ کر گر رہے تھے
کہ جیسے خزاں کی کسی رات کو تیز آندھی چلے تو
درختوں کے پتے
بکھرتے، بچھڑتے ہوئے، در بدر،
کھڑکیوں سے پناہ مانگتے ہیں!

نجانے وہ کیا کہہ رہی تھی
بس اِک دکھ ہی دکھ تھا

ٹپکتا ہوا
سُرخ قالین تک آ گیا تھا

''ہوا مر گئی ہے!''

سبھی مسجدوں، ہوٹلوں، قہوہ خانوں، گھروں میں
یہی اِک خبر تھی،

ہوا مر گئی ہے!
ہوا مر گئی ہے !!

صحافی ،معلم ، ادیب اور شاعر
مسافر، قُلی، ریل باں، ڈاکیے
کارخانوں کے مزدور، دفتر کے بابو
شفاخانو ں کے ڈاکٹر اور نرسیں
سبھی چھابڑی والے
اخبار کے سارے ہاکر

پریشان تھے
سب کے ہونٹوں پہ تالے پڑے
اور آنکھوں میں حیرت کے نیزے گڑے تھے

''ہوا کون تھی؟''
ایک معصوم لڑکی نے امی سے پوچھا
''ہوا ایک ننھی سی گڑیا تھی
اک صبح اسکول کا راستہ بھول کر
جنگلوں کی طرف چل پڑی
اور وہاں ہاتھیوں نے اُسے روند ڈالا!''

بڑے چوک میں
ڈاک خانے کے باہر کھڑی ایک بڑھیا
(جسے لوگ پاگل سمجھتے تھے)
ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی

''ہوا اک بروگن تھی
جانے کسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی؟''

وہ جس نے کتابوں کے دکھ
اپنے سینے میں روشن کیے تھے
اور آنکھوں کے پانی سے
اک روشنائی بنا کر
چمکتے ہوئے حرف لکھتا تھا،
کہنے لگا
''اِک بھکارن تھی وہ!
بس اُسے زندگی کی دعائیں وہ دیتی
جو اپنی کھنکتی ہوئی عمر کی نقرئی ریزگری
سدا اس کے کشکول میں ڈالتا تھا!''

''ہوا مر گئی------!''

بستر مرگ پر کھانستے کھانستے

ایک بوڑھے نے اپنی بہو سے کہا

''وہ جوگن، سپیرن!

نچاتی رہی بین کی تیز لے پر مجھے

زندگی بھر وہ ڈستی رہی کالی ناگن!''

''ہوا کون تھی؟''

مسجدوں، پارکوں، ہوٹلوں، کارخانوں، گھروں میں

یہی بحث تھی

''ہوا مہربان، خوبصورت

ہوا شہر بھر کی ضرورت-----!''

''ہوا زہر تھی، بستیوں کے لئے قہر تھی-----!''

''ہوا داشتہ، فاحشہ، بدچلن، نائیکہ -----!''

''نہیں وہ فرشتہ، وہ مریم، وہ سیتا-----!''

سمندر کی چھاتی سے چپکی ہوئی کشتیوں
اور درختوں کی شاخوں سے لپٹے پرندوں نے پوچھا
''ہوا کون تھی؟''
سمندر، درخت، آسماں سارے خاموش تھے

ں رو رہی

تم نے دیکھا نہیں

تم نے دیکھا ہے؟
جھیلوں میں سوئی ہوئی تشنگی کو
کناروں پہ لیٹی ہوئی بھیگتی دھوپ کو!

تم نے دیکھا ہے؟
بوڑھے، تھکے ماندے، بیمار دریا کو
اکھڑے ہوئے سانس لیتے ہوئے
جس نے گرنا ہے اک دن
سمندر کے قدموں میں
دکھ اپنی بنجر مسافت کا دل میں چھپائے ہوئے!

تم نے رنگوں کی بارش میں بھیگی ہوئی لڑکیوں کو
شرارت بھرے برتنوں کو اٹھائے
سمندر کی لہروں پہ چلتے ہوئے دیکھا ہوگا
کبھی تم نے دیکھی ہے
ساحل پہ بیٹھی ہوئی ایک لڑکی
سمندر میں اُنگلی ڈبو کر
ہوا میں کوئی بات لکھتی ہوئی!

عورت گیان

گاؤں ہے
یا جنگل ہے
گاؤں کے اندر جنگل ہے
یا جنگل کے اندر گاؤں ہے

اِک پیڑ ہے
شاید برگد کا
برگد کی اِک ٹہنی سے کچھ لٹکا ہے
شاید کوئی عورت ہے

ہاں عورت ہے
برگد کی ٹہنی سے اُلٹی لٹکی ہے

زندہ ہے---- شاید مردہ ہے

عین عورت کے نیچے

اِک پتھر پر

کوئی بیٹھا ہے

یوں لگتا ہے

جیسے مردِ گیان میں ہے

عورت اس کے دھیان میں ہے!

جنگل کے راستے میں پڑی ہوئی نظم

شکاری!
بہت تھک چکے ہو
گھنے سائے میں ٹوٹ کر اِس طرح گر پڑے ہو
کہ جیسے پرندہ
کسی آتشیں تیز گولی کی راہ کاٹ کر گر پڑے

واقعی تھک چکے ہو؟
تمہاری (پرانے زمانے کی) بندوق بھی تھک چکی ہے؟
تمہارا وفادار کتا کہاں ہے؟
تھکن اب اسے بھی تو کھانے لگی ہے
سبھی بُھری بُھری ہڈیوں کو چبانے لگی ہے

بہت تھک چکے ہو

اب آرام کرلو

درختوں سے نیچے اُتر کر

ہوا میٹھی لوری سنانے لگی ہے

تمہیں نیند آنے لگی ہے

(جہاں تم زمیں پر پڑے ہو) یہاں سے ذرا دُور آگے

پُرانے درختوں کے سائے تلے

ایک دلدل تمہارے لئے نرم بستر لگانے لگی ہے!

کبوتروں کے لئے ایک دعائیہ

کبوتر
تری دُودھیا ممٹیوں پر
اُترتے رہیں، رقص کرتے رہیں

بارشیں
تیری چھت پر رُکیں
بھول کر راستہ سبز میدان کا
نیچے اُتریں
بھگو دیں کسی خشک دیوار کو
کِھل اٹھیں گھاس میں دُودھیا کھمبیاں
ہر طرف زندگی اُگ پڑے

بارشو!

مہرباں بارشو!

سبز میدان کی سمت جاتی ہوئی بارشو!

صحن کے حوض پر آ رُکو

جس میں لٹکے ہوئے پاؤں

آنسو بھگونے لگے ہیں !

کبوتر بھی رونے لگے ہیں !!

بارشو!

مہرباں بارشو!

تم بھرو وہ کٹورے

کبوتر اُترتے ہیں جن کے کنارے

پیاسے کبوتر اترتے رہیں

رقص کرتے رہیں

نظمیں پیلی ہو جاتی ہیں

اُس کی آنکھوں میں اُڑنے والی چڑیا
میرے دل کا پنجرہ چُگ لیتی ہے
نظمیں شرمیلی ہو جاتی ہیں

اُس کی باتوں کے ساحل پر
بیٹھے بیٹھے شامیں بھیگنے لگتی ہیں
نظمیں گیلی ہو جاتی ہیں

اُس کے خوابوں کے رستوں پر
چلتے چلتے پاؤں دُکھنے لگتے ہیں
نظمیں نیلی ہو جاتی ہیں

اُس کے ہاتھوں پر لکھی سبز لکیریں
پڑھ کر، آنکھیں بجھنے لگتی ہیں
نظمیں پیلی ہو جاتی ہیں

باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی

کہانی شام پڑتے ہی
مجھے باتوں کی بارش میں بھگو دے گی
اداسی زائچہ میرا بنائے گی
گھنے جنگل میں رستہ بھول جائے گی

کہانی بھیگ جائے گی
کتابوں میں نمی سی پھیل جائے گی
مہکتی موت چپکے سے
مری آنکھوں پہ اپنی انگلیاں رکھ کر
خموشی تیز کر دے گی!

کہانی روٹھ جائے گی
مجھے ڈھونڈے گی تنہائی
اکیلی رات کی چھت پر
پہاڑی ڈاک بنگلے میں
گھنے جنگل میں، خوابوں میں
نئی نظموں، پرانی غیر مطبوعہ محبت میں
کتابوں میں !

(مظہرالاسلام کے لئے)

وہ اکثر بھول جاتی ہے

کبھی خوابوں کے جنگل میں
اکیلے پَن کی دلدل میں
کسی صندل کے سائے میں
کبھی بادل کی چھتری پر
کسی دن تیز بارش میں
کبھی دریا کے دھارے پر
کبھی دُکھ کے کنارے پر
کبھی ساحل پہ لکھتی ہے
کبھی لکھ کر مٹاتی ہے
کبھی لکھنے سے پہلے ہی
مٹا کر ہنسنے لگتی ہے
کسی دن شام سے پہلے
مٹانا بھول جاتی ہے
تو ساری رات روتی ہے

ہوا جب اِذن دیتی ہے

ہوا جب اِذن دیتی ہے
تو پتے سرسراتے ہیں
سُریلے گیت گاتے ہیں

ہوا جب اِذن دیتی ہے
تو ہونٹوں پر
صدا کے پھول کھلتے ہیں

ہوا جب اِذن دیتی ہے
تو شاخوں کو پرندے چھوڑ جاتے ہیں
شجر کے سبز دھاگے توڑ جاتے ہیں!

بارش میں جل پریوں کا ملبوس اُتر جاتا ہے

جولائی کی پہلی طوفانی بارش
تالابوں کو بھر دیتی ہے
جھیل چھلکنے لگتی ہے
دریاؤں کی طُغیانی خوابوں تک آ جاتی ہے
بارش ہوتی رہتی ہے
رات بھگوتی رہتی ہے
جل پریوں کی آنکھ مچولی
نیندوں کا ملبوس بدلتی رہتی ہے

اگلی صبح
مری بیوی
میرے لَت پَت کپڑوں میں
مچھلی ڈھونڈتی رہتی ہے!

موت خوبصورت ہو جاتی ہے

موسم کی پہلی
ہلکی ہلکی بارش میں
قبرستان کی جانب جانے والے
بوڑھے
بچپن کی خواہش جیسے ہو جاتے ہیں
تتلی کے پیچھے
بھاگتے بھاگتے
دُور اُفق میں کھو جاتے ہیں!

جیون دو دھاری تلوار ہے سائیں!

جیون دو دھاری تلوار
جیون دو دھاری تلوار ہے سائیں
دو دھاری تلوار

تُو چاہت کا چڑھتا دریا
مَیں مِٹّی کا کچّا پیار
اور جانا اُس پار
جیون دو دھاری تلوار

دُنیا مارے پُھول
لاگے تن کی اوٹ فضول
تُو آ کے پتھر مار
جیون دو دھاری تلوار

تو آبِ زَم زَم سے میٹھا
مَیں اِک جلتی پیاس کا صحرا
گندا برتن دُنیا دار
جیون دو دھاری تلوار

دُکھ کے پنجرے میں اِک طوطا
اِک دن اُڑ جائے گا روتا
دل میں پالے کون قرار
جیون دو دھاری تلوار

جیون دو دھاری تلوار ہے سائیں
دو دھاری تلوار!

کبوتر صراحی کے چاروں طرف گھومتا ہے

کبوتر
صراحی کے چاروں طرف گھومتا ہے!

صراحی کے اندر اُترنے کی خواہش
کنارے پہ بیٹھی ہوئی ہنس رہی ہے!

صراحی کے پیندے میں پانی
چمکتا ہوا آبِ سیمیں!
کبوتر کے اجلے پروں پر
بکھرتا ہوا آبِ سیمیں!
کبوتر کی آنکھوں سے
بہتا ہوا آبِ سیمیں!

کبوتر کی آنکھوں سے رِستا ہوا دکھ

صراحی کا دکھ ہے

صراحی کے اندر چمکتا ہوا دکھ

کبوتر کا دکھ ہے

صراحی کا دکھ ہے!

کبوتر

صراحی کے چاروں طرف گھومتا ہے!

بچپن کی ایک بوڑھی یاد

سارے بچے
ریت گھروندوں کے
شہر بناتے رہتے تھے
لیکن مَیں
اُن سب سے دُور
اکیلا بیٹھا
ننھی سی اِک قبر بناتا رہتا تھا!

بدن کے پار دلدل ہے

دُور بہت خوابوں میں دُور
چُور بہت نیندوں میں چُور
دُور بکھرتے رستوں پر
یادوں کے چُر مُر پتوں پر
گھوم رہی ہے ننگے پاؤں
ڈھونڈ رہی ہے ہریل چھاؤں
چلتے چلتے، حدِ زمیں تک
آنکھ سے اوجھل ہو جائے گی
دُکھ سے بوجھل ہو جائے گی

ایک نظم دریائے سواں کے کنارے پر ڈوب گئی

اُسے الفت کے سب اسباق اَزبر تھے
وہ چاہت کے سبھی رنگوں سے واقف تھی
محبت کے تقاضوں کو سمجھتی تھی
ملن کے سب لوازم پیش کرنے کا سلیقہ جانتی تھی
محبت کی ہر اِک تتلی
وہ چاہت کے سبھی جگنو
مری مٹھی میں دے دیتی
مرے سانسوں میں خوشبوسی جگا دیتی
گھنیری شام جلتے دن کے سینے پر بکھر جاتی

مرے صحرا بدن پر وہ
سنہری دھوپ کی مانند بھی کھلتی
کبھی بدلی کی صورت بھی برستی تھی
مکمل یوں تو ہر اک زاویے سے تھی
مگر کچے گھڑے کے ذکر پر
وہ اکثر کانپ جاتی تھی!

بے وجود آدمی کا دُکھ

نہ قاف کے یہ سلسلے
نہ جِن پَری کا دیس ہے
نہ مَیں کسی کی قید میں
نہ کوئی میرا بھیس ہے
تو پھر نجانے کیوں مجھے
وہ بدنصیب آدمی
ابھی تلک وجود میں
جو قید بھی نہیں ہوا
اُداس اُداس رکھتا ہے !

کہانی لکھ رہی تھی

کہانی لکھنے والے کو
کہانی لکھ رہی تھی
جوانی لکھنے والے کو
بڑھاپا لکھ رہا تھا

جوانی سے بہت پہلے
بڑھاپا سہنے والے کو
جوانی لکھ رہی تھی

پہلے دن کی دھوپ

جنگل میں
خاموشی ٹانگیں پھیلائے لیٹی تھی
سناٹا اس کے پیڑو کو سہلاتے سہلاتے
اُونگھ رہا تھا
درد کا دریا بہتے بہتے رک کر
گہری سانسیں لینے لگا تھا
بے چینی لمبے لمبے ڈگ بھرتی
بوڑھے برگد تک جاتی تھی
لیکن اُس کے نیچے
بوڑھی مریل چُپ کو سوتا پا کر
واپس آ جاتی تھی

ماں نے گھاس کا خوشبودار بچھونا کھول دیا تھا
سُرخ سنہری گرم رضائی
سُورج نے اُس کے بستر پر رکھ دی تھی
بادل اُس کے پہلے غسل کا پانی
پاک مصفّا دوری کے چشمے سے
آنکھوں کی چھاگل میں بھر لائے تھے
صدیوں کی بے تابی نے
اپنے نرم ملائم ہاتھوں سے پیڑو کو سہلایا
اس نے درد کی آری سے کٹتا جسم سمیٹا
کود کے باہر نکلی
چیخ----!
بیر بہوٹی جیسا اس کا رُوپ سُروپ
وہ اظہار کے پہلے دن کی دھوپ!

آنکھ میں رُکا ہوا انتظار

جھیل کی شفاف سطحِ آب پر
اک کنول کا پھول اپنی آنکھ رکھے
آسماں کی وسعتوں میں
گمشدہ مرغابیوں کا منتظر ہے
اب کے اِس ڈائن ہَوا نے
جانے کیا جادو کیا ہے
تشنہ پر مرغابیوں کے ذہن سے
جھیل کا رستہ اُترتا جا رہا ہے!

گمشدہ بوڑھا

تین پرانی
بوڑھی سکھیاں
اکتوبر کی بھیگی شام کنارے بیٹھی
خاموشی کے چلغوزے چٹخا کر
ہنستی ہیں

ان کے پوپلے منہ سے
خوشبو لچ لچ کرتی گرتی ہے

لان خوشی سے بھر جاتا ہے

اندر، نیم اندھیرے کمرے میں
ویڈیو گیم کی تنہائی میں گم
بوڑھا بچہ ڈر جاتا ہے!

برف

برف پڑی ہے
حدِّ نظر تک ---- اُس کے گھر تک

برف پڑی ہے
بُھوری، شنگرفی پگڈنڈی پر
اُس کے پاؤں کی خوشبودار گلابی مٹی پر
سبز ہمکتے گندم کے کھیتوں پر
دور فضا میں اڑنے والے
نیلے سرخ پرندوں کے گیتوں پر !

برف پڑی ہے
سرخ چناروں جیسی باتوں کے جنگل پر
نرم رسیلی عمر کی کچی گندل پر
تیرے میرے وعدوں کے صندل پر
خوابوں کی مخمل پر!

برف پڑی ہے
اسکول کے بوڑھے چوکیدار کی باتوں پر
دس تک گنتی لکھنے والے بچے کی تختی پر
اُجلی آنکھوں والی ٹیچر کے ہونٹوں پر
بستوں میں سہمی کتابوں، نُور نصابوں پر
سچّے پانچ فرشتوں ---- ننھے پاک رسولوں پر
پھولوں پر

برف پڑی ہے
بچے گرم لحافوں میں

خوابوں کے نرم غلافوں میں
چوزوں کی صورت دبکے ہوئے ہیں
لیکن اُن کی ماں کی آنکھیں
سات سمندر پار کسی صحرا میں پڑی ہیں
ہارڈ کرنسی کچے مکانوں تک لانے میں
کتنی عمریں رستے کی دلدل میں گِر جاتی ہیں
کھیل کھلونے سینے سے چپکا کر
سونے والے بچوں کو معلوم نہیں!
خوشحالی کے فیتے سے
چاہت کا رشتہ ناپنے والی عورت کو
اپنے شوہر کے بستر پر
رات کے پچھلے پہر
ایک سنہری لاش پڑی ملتی ہے!

برف پڑی ہے
مسجد کے گنبد پر

منبر سے گرتے لفظوں پر

محراب کے اوپر طغرے پر
طاق میں رکھے پہلے سچ پر
رحل کے نیچے بہنے والے سُرخ لہو پر---اللہ ہُو پر!
مینار سے گرنے والی صَدا پر
ننھی دعا پر!

برف پڑی ہے
ٹی بی وارڈ کے باہر بیٹھی لڑکی کے چہرے پر
اجلے گاؤن والی نرسوں کے خوابوں پر
کھانسی کا سیرپ لینے والی لائن پر
ایمرجنسی رُوم کے باہر بیٹھی
اِک ننھی سرگوشی پر
ایمبولنس کی جلتی بجھتی بتی پر

برف پڑی ہے
بوڑھے قبرستان کی ٹوٹی پھوٹی قبروں پر
برف نے ساری قبریں اک جیسی کر دی ہیں
قبروں کے اندر زندہ ہیں
سانپ اور مور کے لمبے قصّے
برف کی قبریں--- برف کے کتبے
برف سے میرا نام لکھا ہے!

گمانیہ

مَیں سایا ہوں
آگے آگے جانے والی عورت کا
یا پھر شاید
پیچھے پیچھے آنے والی عورت کا!

موت خودکشی کا انتظار کرتی ہے

باہر

دروازے پر

خاموشی کا بچھو

تالا بن کر لٹکا ہے

اندر

کمرے میں

اُس کے بستر پر

سناٹا

میلا کمبل اوڑھے لیٹا ہے

اپنی چیخ کی تیز چھری کو

دانتوں میں پکڑے

بیٹھی

سوچ رہی ہے

اس پر وار کروں!

اپنا آپ شکار کروں!!

دسمبر بوڑھا ہو جاتا ہے

ننگی خواہش
آتش دان کے آگے بیٹھی
کانپ رہی ہے

اُسے تنہائی سمندر پر لکھتی ہے

ہرے موسم اُسے آواز دیتے ہیں
پرندے آسماں کے درمیاں جب راستہ اپنا بناتے ہیں
تو وہ جنگل کی تصویریں
اُٹھا کر میز کے نیچے پڑی
اک ڈسٹ بِن میں پھینک دیتا ہے
بڑے ہوٹل میں ہونے والے فنکشن کی رپورٹنگ سے
اسے بستر کی سیلی باس آتی ہے
اُسے لفظوں کی سیڑھی پر کھڑے بونے
بڑے دلچسپ لگتے ہیں
کسی سرکس کے یہ جوکر
اُسے پہروں ہنساتے ہیں

مگر ننھی الیفہ ☆

اس کی باتوں سے
ہنسی کو توڑ لیتی ہے
وہ ریستوران میں گزری ہوئی شاموں کو پڑھتا ہے!
سمندر پر بہت ہی دور تک پھیلی ہوئی تنہائی لکھتا ہے!!

☆انوار فطرت کی بیٹی

بلی لوٹن

رات کی چھت پر
گنبد والی ممٹی کے نیچے
لڑنے والی
خونی بلیوں کی چیخوں میں
ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں
میرے خواب
اور تیرے خواب
خوشبودار، گلابی خواب!

سرگوشی

ریت پر
بکھرے ہوئے
اِک دریدہ بادباں سے
لہر نے آ کر کہا
'کیوں، ہَوا کی دوستی کیسی رہی؟'

بے خبر کوّوں کی موت

آنے والے موسم میں
ٹُنڈ مُنڈ پیڑوں سے
آندھیاں گلے لگ کر
بَین کر رہی ہوں گی

بے لباس شاخوں پر
تین چار کوّوں کی
دھجیاں ٹنگی ہوں گی

زمین کے لیے ایک نظم

وہ سارے عاجزی کے رنگ
سجا کے اپنے چہرے پر
طلب کرتی ہے بارش
آسماں سے
(مانگتی ہے بھیک میں اپنی امانت
جو ہوا کے ہاتھ بھیجی تھی)
تو نیلا آسماں ہنس کر
زمیں پر تھوک دیتا ہے!

ہوا مجھ کو بلاتی ہے

جہاں بادل سنورتے ہیں
جہاں بارش نکھرتی ہے
کنارے شام کے ، تارا
جہاں تنہا نکلتا ہے
جہاں کچی منڈیروں پر
کسی شب چاند اُترتا ہے
کہیں شفاف جھیلوں پر
جہاں سورج نہاتا ہے
جہاں سونا بکھرتا ہے
جہاں چاندی چمکتی ہے
جہاں وہ جسم کی خوشبو
دھندلکے میں جگاتی ہے
ہَوا مجھ کو بُلاتی ہے

ٹھہرا ہوا موسم

چیل کے اونچے درختوں میں
پہاڑی طرز کے
اک ڈاک بنگلے کے کشادہ لان میں
دو بدن لپٹے ہوئے
سمٹے ہوئے
جلتے ہوئے
بارشوں کے منتظر تھے
اور ان کے سامنے کچھ فاصلے پر
آنسوؤں کی جھیل پر بیٹھی ہوئی
زرد رُو لڑکی پہاڑی گاؤں کی
دور افق سے بادلوں کے لوٹ جانے کی دعا کرتی رہی!

جادوگرنی بھوک بن جاتی ہے

محبت کے تنور میں
دوزخی آگ روشن کیے بیٹھی
وہ جادوگرنی
اچانک توازن بگڑنے سے
تنور میں جا گری
گندمی جسم کا ذائقہ
اس کے اندر اُتر کر اسے کھا گیا
اب اندھیرا کنواں (سرد تنور) ہے
جس میں اک آدمی
کالی راتوں کے ہاتھوں سے گرتی ہوئی راکھ میں
دب رہا ہے

وہمی آدمی چوہے دان میں مرجائے گا

کئی دن سے
مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ میرے جسم کے اندر
کسی کونے میں
کوئی چوہیا مردہ پڑی ہے
میں پہلے اِس کو اپنا وہم سمجھا تھا
مگر اخبار کی سرخی بھی کہتی ہے
ہمارے شہر میں
طاعون کو پھیلے ہوئے
اب ساتواں دن ہے!

گوری آپ مقدر والی

گوری آپ مقدر والی
شام پڑی اور وحشی موسم
کس نے بات سنبھالی
گوری آپ مقدر والی

سُرخ اناری میلے میں سے
چُن لی کس نے کالی
گوری آپ مقدر والی

جلتے تھل میں کس نے رکھے
موسم آنکھوں کے چترالی
گوری آپ مقدر والی

جس کا سائیں راضی
اُس کی رات نمازی
کوئی بات نہیں ڈر والی
گوری آپ مقدر والی

ناگنی

میرے اندر
پھن پھیلائے
زہر سمیٹے
جھوم رہی ہے
ایک گلابی ناگن!

پرانی کہانی

ندامت کے بستر پہ بیٹھی ہوئی
سوچتی ہے
کہانی میں جس مرد کا ذکر تھا
کہیں یہ وہی تو نہیں؟

وہ زینے میں بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو جاتی ہے

نیند میں چلنے والی لڑکی

زینے میں

بیٹھی

اونگھ رہی تھی

نیچے صحن میں سناٹا تھا

اوپر چھت پر تنہائی تھی!

کہتے ہیں

پہاڑوں پر
گِری برفوں کے دکھ
دریا میں بہتے ہیں
سمندر تشنہ رہتے ہیں!

فراک

فراک دیکھتے ہی وہ
ہنسی، گلاب کی طرح
دکان میں گلاب ہی گلاب سے بکھر گئے
''مجھے یہی پسند ہے
اِسی فراک کی تلاش تھی مجھے!''

فراک بھی یہ بات سُن کے کھل اٹھا
وہ لوہے کی صلیب پر
گزشتہ سات روز سے ٹنگا ہوا تھا
زندگی کا منتظر تھا!

اُس کی بات سن کے ہنس پڑا
خوشی بھری یہ بات اُس نے
جھالروں کی اوٹ میں چھپے ہوئے
شریر دل کے پاس ٹانک دی!

دُکاندار نے کہا
''بہت ہی قیمتی فراک ہے
نہیں خرید پاؤ گی!''
تو سات سالہ گُڑیا اس کی بات سن کے ہنس پڑی
''ہمارے پاس رقم کی کمی نہیں ہے
ماں نے سات سال بعد
میری گولک آج صبح توڑی ہے!''

مگر فراک!
اُس کی ماں کے پرس میں رکھی ہوئی
تمام رقم سے بھی سات سال مہنگا تھا!

وہ ماں کو چپ، اداس دیکھ کر
اداس خود بھی ہو گئی
تو سات سال اور ----- سات سال اور
عمر سے بڑی لگی!
دکان میں کھڑے کھڑے وہ دونوں بوڑھی ہو گئیں!
پرانے، دفن شہر کے کسی کھنڈر میں کھو گئیں!

انہیں اداس، خالی ہاتھ
چپ لیے
دکان سے نکلتا دیکھ کر
دکاندار اداس تھا!

دکاندار اداس تھا
کہ بِک نہیں سکا فراک!
اسے تو کچھ خبر نہ تھی

کہ اس کی اِک ڈکار جتنے وقفے میں
کسی کا قتل ہو گیا
کوئی صلیب چڑھ گیا!

وہ اِک دکاں
جو سات لاکھ سال بعد
دفن شہر سے ملی
تو خلق ساری آ گئی
تماشا دیکھنے فراک کا
جو شہر سات لاکھ سال پہلے مر چکا تھا
دفن تھا!

وہ پھر سے زندہ ہو گیا
وہ خاک سات لاکھ سال بعد پھر سے خلق بن گئی!

صلیب پر
فراک تھا ٹنگا ہوا
ٹپک رہا تھا خون اُس کی جھالروں سے
خون تھا کہ سرخ سرخ نور تھا!

جو سات لاکھ سال سے
فراک کی تلاش میں بھٹک رہا تھا
چیرتا ہوا ہجوم کو بڑھا
فراک کو صلیب سے اتار کر
زمیں کی نرم گود میں لٹا دیا
سلا دیا

وہ چُوم کر فراک کو
صلیب پر ہوا بلند
خود فراک بن گیا!

زمین گھومتی رہی ہے
(پاگلوں کے ہاتھوں میں)
زمین گھومتی رہے گی
تشنگی صلیب کی ----- نہیں بجھی
نہیں بجھے گی!

بہتی عمر کی ناؤ میں

بارش میں
خالی گھر خوابوں سے بھر جاتے ہیں
گلیاں جل تھل ہو جاتی ہیں
آنکھیں ڈوبنے لگتی ہیں
اور کاغذ کی ڈولتی ناؤ میں
سہما ہوا ننھا دل
ہچکولے لیتے لیتے سو جاتا ہے

سانپ نے اندھے لفظ کا لنچ کیا

اندھا لفظ

خاموشی کی چادر اوڑھے

نظم کے دروازے پر کب سے کھڑا ہے

دستک دیتے دیتے رُک جاتا ہے

نظم نجانے اندر کیسے مُوڈ میں ہو

یوں بے وقت چلے آنے پر

ناراض نہ ہو جائے

آواز بدل کر کہہ دے

''اندر کوئی نہیں ہے!''

یا پھر تیزی سے دروازہ کھولے

اور اُس پر

جذبات بھرے انگاروں کا چھاج اُلٹ دے

غصے میں ہوتو

اس پر ٹوٹ پڑے

بوٹی بوٹی کر کے

دروازے کی چوکھٹ پر

عبرت کی کیلوں سے لٹکا دے!

ڈرتے ڈرتے

لفظ نے دستک دے ہی دی

ہولے سے دروازہ کھول کے نظم نے باہر جھانکا

اور پھر اوٹ میں ہو کر

جسم سے باہر ہاتھ نکالا

اندھے لفظ کے ہاتھ پہ رکھ دی

خیرات چھڑی کی

ہاتھ پہ کُنڈلی مارے بیٹھا تھا

اِک سانپ!

اُس کون چنُے گا

ردی کاغذ چننے والی لڑکی کو معلوم نہیں
افراطِ زر کیا ہوتی ہے
قیمتی کاغذ کیسے ردی پُرزے بن جاتے ہیں

ردی چیزیں چننے والی لڑکی کو معلوم نہیں
گندے ڈھیروں پر بکھرے
بدبودار غُباروں سے
کس کے رونے کی آوازیں آتی ہیں
ننھے نور فرشتے
کیسے ماؤں کی گودوں سے گر جاتے ہیں

ردی چننے والی لڑکی کو
ردی کاغذ میں لپٹی اِک بات ملی ہے
اور اُسے معلوم ہوا ہے
ردی چنتے چنتے
وہ بھی اِک دن ردی کاغذ بن جائے گی!

بھوک رونے لگتی ہے

تم نے

بجلی کے تاروں میں

مُردہ چیل کو

لٹکے دیکھا

سچ کہتی ہو

''بھوک تو بجلی کے تاروں میں

اٹک گئی ہے---!''

دیکھو!

میں نے چیل کے پنجوں میں

مرغی کا چوزہ دیکھا ہے

روئی بکھرتی دیکھی ہے

موت نکھرتی دیکھتی ہے

ننھی آنتیں تاگا تاگا ہوتی دیکھی ہیں

سانس ادھڑتی دیکھی ہے

میں نے موت کے پنجوں میں

بھوک تڑپتی دیکھی ہے!

آؤ!

تھوڑا سا

کھانا کھالیں

خالی پیٹ تو رونا بھی مشکل ہوتا ہے!

PARADOX

ہونٹ لال ہو گئے
بات پیلی ہو گئی
وہ لپٹ کے سو گئے
رات نیلی ہو گئی
خواب پورے ہو گئے
آنکھ گیلی ہو گئی

شاعر

آنسو بونے والا
نظمیں کاٹ رہا ہے!

ایک دن ہوا گر پڑی

بہت سال گزرے
ہوا اِک سفر پر روانہ ہوئی تھی
گھنے جنگلوں
دور پھیلے ہوئے سبزہ زاروں
پہاڑوں کو چھوتے ہوئے
آسماں کے کناروں کی جانب گئی تھی
وہ سیٹی بجاتی ہوئی اپنی دُھن میں مگن تھی
اُسے بس نئے منطقوں کی لگن تھی

ہوا، خوبرو آرزو کی طرح
رقص کرتی ہوئی
جستجو کی طرح
دور ہوتی گئی
دور ہوتی گئی
آسماں کے کناروں کو چھونے کی خواہش میں
اِک دن اچانک پھسل کر گری
دور نیچے کہیں
رو رہی ہے زمیں !

مگر مچھلی خواب کے اندر مر جاتی ہے

ابھی شاخ پر مسکراتے ہوئے گھونسلے سے

جو انڈا گرا تھا

وہ انڈا تھا کوئی --- پرندے کا انڈا

یا آنسو تھا کوئی --- فرشتے کا آنسو!

مگر پھیلتے پھیلتے

ایک تالاب سا بن گیا ہے

یہ تالاب اب پھیلتا --- پھیلتا --- پھیلتا جا رہا ہے

یہ تالاب ہے یا سمندر ہے

جس میں

ہزاروں طرح کی

کئی رنگ کی

مچھلیاں تیرتی پھر رہی ہیں

بہت چھوٹی چھوٹی اگر مچھلیاں

بہت موٹی موٹی مگر مچھلیاں

یہ --- کیا--- ہے؟

یہ کیا ہو رہا ہے؟

کئی ننھی مُنّی اگر مچھلیاں

دیو ہیکل مگر مچھلی کو کھا رہی ہیں!

میں واپس آ جاؤں گا

جس دن
اس کی رات سے بھیگی
نیلی آنکھیں
صحن میں دھوپ بچھا دیں گی
میرے خوابوں کو دھو کر
دیواروں پر پھیلا دیں گی
میں واپس آ جاؤں گا

جس دن

بابے خیرو کے ہاتھوں سے

تنور میں روٹی گر جائے گی

اس کی لمبی بر فیلی داڑھی پر

غصے کا انگارہ

گرنے سے پہلے بجھ جائے گا

میں واپس آ جاؤں گا

جس دن

سورج میری گلی میں

کیک، کتابیں، خوشیاں

کھیل، کھلونے، بستے

میلے ہاتھوں والے بچوں میں بانٹے گا

میں واپس آ جاؤں گا

وقت کی اندھی سُرنگ میں

محرابی دروازے پر لٹکی آنکھیں
نیچے اُتریں
میرے خوابوں کی گٹھڑی کو کھولا
اِک اِک خواب ٹٹولا
پھر بولیں
جاؤ! طلسم کدے کے اندر
چوبی صندوقوں میں رکھی لاشیں غور سے دیکھو
اُن میں سے چھ لاشیں---- چھ مرد تمہارے بھائی ہیں!
جاؤ! پہچانو!
اعلیٰ نسب کا خوشبودار لہو

سنگی دیواروں پر لٹکی
لمبی لال زبانوں سے مت ڈرنا
ان سے بہنے والی باتوں کے نیچے کان نہ رکھنا
دیکھو!
چوتھی سمت نہ جانا
چوتھی سمت میں ایک سُرنگ ہے--- وقت کی اندھی گول سُرنگ
جس کے آخر میں تم اس سے ملو گے
جس سے پہلے باری باری سارے بھائی ملے تھے
تم بھی مل سکتے تھے
حیف! طلسم کدے میں
ایک نئے تابوت کی گنجائش ہوتی!

وہ اپنی آنکھیں میز پر رکھ کر بھاگ گیا تھا

وقت سے پہلے
خود کو پورا دیکھنے والے
اندھے ہو جاتے ہیں!

چیخ اُس کی قاتل ہے

کس قدر عجیب تھا
ایک بار زور سے
چیخ کر وہ ڈر گیا

ساٹھ سال بعد پھر
ایک بار زور سے
چیخ کر وہ مر گیا

نظم مکمل ہو جاتی ہے

میں جب سونے لگتا ہوں
لفظوں کے کانٹے
میرے بستر پر اُگنے لگتے ہیں
نیلی نیند رضائی میں سمٹی
ننھی پریوں کے
نرم گلابی جسموں میں چبھنے لگتے ہیں

دیکھتے دیکھتے
ساری پریاں
کالی چیونٹیاں بن جاتی ہیں
کیسے کالے جادو گر ہیں
یہ الفاظ !

مَیں جب رونے لگتا ہوں
کمرے کی دیواروں پر
رنگ برنگی چڑیاں اُگ آتی ہیں
اونچا اونچا ہنستی ہیں

چڑیاں
ساری چیونٹیاں
چُن چُن کر چُگ لیتی ہیں
پھر پریاں بن جاتی ہیں

میں ہنستا روتا رہ جاتا ہوں
جاگتا سوتا رہ جاتا ہوں
نظم مکمل ہو جاتی ہے

کبوتر کی خودکُشی

----- کبوتر کئی دن سے خاموش تھا
اس کی آنکھوں میں جلتا ہوا خواب بجھنے لگا تھا
اڑان اس کے میلے پروں پر
تھکن بن کے گِرنے لگی تھی
بہت دور پھیلا ہوا آسماں بھی سمٹنے لگا تھا
اندھیرا بکھرنے لگا تھا

وہ گندم کے دانے
ہتھیلی پہ رکھے ہوئے
سوچتی ہے
کبوتر فرشتوں کی پاکیزگی کی علامت
تقدس کی تمثیل ہیں
کبوتر محبت کی انجیل ہیں!

اُسے کیا خبر
کبوتر نے مکھی نگلنے سے پہلے
کئی بار سوچا تھا- - - -

تیز ہوا میں جنگل مجھے بلاتا ہے

بجھا کر لالٹین
اندھی ہَوا
روتی ہوئی گھر سے نکلتی ہے
اندھیرے بال پھیلائے ہوئے
گلیوں میں ننگے پاؤں چلتی ہے
سڑک پر بکھرے پتّوں کو
پرانے زرد خوابوں کو
اُٹھا کر چُومتی
لوری سُناتی ہے
دلاسے بانٹتی ہے

گھنے جنگل کی جانب جست بھرتی، کوکتی
صحرا بچھاتی جاتی ہے
پرانے مہرباں رشتے، تعلق بھول جاتی ہے
گرا کر گھونسلے شاخوں سے، ہنستی ہے
لرزتے، کانپتے، ڈرتے، اُڑانیں مانگتے، گرتے
پرندوں کو پٹختی ہے
لہو میں تر، بکھرتے پر اُڑاتی ہے
کڑکتی، ٹوٹتی شاخوں کو کھاتی ہے
ہری چیخیں چباتی
جھاڑیوں میں رقص کرتی ہے

گھنیرے خواب میں بکھرا ہوا جنگل سسکتا ہے
کوئی سہمی ہوئی، بوڑھی، اکیلی رات کے سینے میں
خنجر گھونپ دیتا ہے

خالی گھروں میں دیور ہتے ہیں

نہیں بچو!
نہیں سُنتے کہانی شام سے پہلے
کہانی دن کو سوتی ہے
اگر اس کو گھنیری نیند کی شاخوں سے توڑو تو
مسافر بھول جاتے ہیں
پرانے راستوں کی ہر نشانی کو
مسافت پاؤں سے کھل کر
گھنے جنگل میں کھو جاتی ہے
دکھ اپنے گھروں کو لوٹ آنے کا
اکیلا چھوڑ جاتا ہے
ہمارے اور اُن کے درمیاں
کوئی بہت نازک سا دھاگہ ٹوٹ جاتا ہے

تمہیں معلوم ہے؟
خالی گھروں میں دیو رہتے ہیں
کہانی ایک اکیلی آنکھ والے دیو کے ڈر سے
تمہارے ننھے بستوں سے نکلتی ہی نہیں ہے

تمہارے ابو کہتے تھے
کہانی لکھی جاتی ہے
ہمیشہ رات کے دکھ میں
کسی کے ہونٹ سے ٹوٹی ہوئی
اک بات کے دکھ میں!

جنازے کا وقت ہو رہا ہے

کبوتر!
بہشتی پرندے!
فرشتوں کی پاکیزہ پوشاک میں
آنے والی خدائی محبت!
تجھے آسمانی صحیفوں میں لکھی ہوئی روشنی کی قسم
بتا!
اوس روتی ہوئی رات مینار سے کب گرے گی؟
کہ اک خواب کی لاش
مسجد کے برآمدے میں پڑی
دفن کی منتظر ہے
مؤذن ابھی صبح ہونے نہ ہونے کی
تشکیک اوڑھے ہوئے سو رہا ہے

ہوا کے راستے نہیں ہوتے

ہوا کا راستہ کوئی نہیں ہوتا
وہ خود رستے بناتی ہے
اسے دشوار پتھریلی پہاڑی پر
بچھی پگڈنڈیاں اچھی نہیں لگتیں
وہ خوابیدہ گھنیری جھاڑیوں کے درمیاں
رستے جگاتی ہے
پرانے زرد پیڑوں سے
ہرے موسم کی خواہش کو اڑاتی ہے
نئے جنگل اگاتی ہے

دسمبر اُس کو لینے آ جاتا ہے

خواب
اس کی آنکھوں سے
قطرہ قطرہ بہتے ہیں
وہ تعبیر کی انگلی تھامے
سوکھے پتّوں سے پُر رستوں پر
دور بہت دور نکل جاتا ہے

نظمیں
اس کو لکھتی ہیں
برفیلے موسم کے کاغذ پر
اور اُداسی اُجلے لفظوں کی
اُس کے ہونٹوں سے بارش بن کر
گرتی ہے

خاموشی

خودرو بیلوں کی صورت

اُس کے سینے کی جنگلتا میں

پھیلنے لگتی ہے

تنہائی

اُس کا پیچھا کرتی ہے

خوابوں سے نظموں تک

رستے ختم نہیں ہوتے

نظمیں تھک جاتی ہیں

لفظ بکھرنے لگتے ہیں

خواب ٹھٹھرنے لگتے ہیں

اور دسمبر اُس کو لینے آ جاتا ہے

(نصیر احمد ناصر کے لیے)

کبوتر کے پروں پر لکھی لوری

کبوتر!

کہو تم!

فقط تم مقدس زباں جانتے ہو

کبوتر!

ابھی تم یہ کیا کہہ رہے تھے؟

محبت کے چشمے کہاں بہہ رہے تھے؟

کہاں بہہ رہے ہیں؟

کہ ہم تو---زمانوں کے دکھ سہہ رہے ہیں!

کبوتر!

مقدس زمینوں زمانوں کے قصے سناؤ

مقدس زباں میں سناؤ

فقط تم مقدس زباں جانتے ہو

مقدس زباں --- جو ہمیشہ سے زندہ ہے

زندہ رہے گی

مقدس زباں کے پیمبر ہو تم!

مقدس زباں سے

مَیں خوب آشنا ہوں

ہمیشہ ہی سنتا رہا ہوں

زمانے کے جھولے میں مجھ کو

وہ لوری سناتی رہی ہے

وہ لوری سناتے ہوئے ایک دن رو پڑی تھی!

کبوتر!

اُسے جانتے ہو---؟

مجھے اُس نے آٹے میں گوندھا ہوا ہے

بنیرے پہ بیٹھی ہوئی
نظم نے اُس سے پوچھا
تو کیوں رو رہی ہے؟
سہاگن!
مری اچھی، پیاری سہاگن
تو کیوں رو رہی ہے؟

سہاگن نے صحنک میں گوندھے ہوئے
نرم آٹے کو
گیلی، رسیلی ہتھیلی سے یوں تھپتھپایا
کہ جیسے وہ بارش میں بھیگے کبوتر پہ
آنسو بھرا ہاتھ رکھے
کہیں کھو گئی ہو!

وہ گوندھے ہوئے نرم آٹے میں
گوندھی گئی

نظم کو کیا بتاتی
کہ اُس نے کسے
اپنے ہاتھوں سے
صحنک بھرے نرم آٹے میں
گوندھا ہوا ہے
جو اُڑتے ہوئے حرف کے ساتھ اُڑنے کا فن جانتا ہے!

مجھے دیوار پر اس نے وہاں ٹانکا ہوا ہے
جہاں سے دیکھ سکتا ہوں
زمیں کے اس طرف پھیلی گھنیری، سرمئی تنہائیاں
جو خود اس نے کبھی تحریر کی ہوں گی
ازل سے تا ابد پھیلے خلا پر!
مگر جب سے وہ خود اپنی خبر میں ہے
اسے دیوار کی اس دوسری جانب کی
کوئی بھی خبر اچھی نہیں لگتی
خبر نے اس کو کیسا بے خبر رکھا ہوا ہے!!

ISBN: 969 - 8127 - 05 - 4

لیو بکس اسلام آباد